ترتیب

۞ جدید اسلامی ریاست کے اجزائے ترکیبی ۵
☆ جدید اسلامی ریاست میں قومیت کا مسئلہ ۲۳

۞ اسلام اور سماجی انصاف ۳۳
☆ پاکستان میں سماجی انصاف کا اوّلین تقاضا: ۴۱
ایک نیا اور منصفانہ بندوبست اراضی

۞ مسئلہ ملکیتِ زمین ۵۱

۞ خلافت، ملوکیت اور جاگیرداری ۶۰

۞ اسلام کے دو معاشی نظام ۷۱
☆ اسلام کا قانونی نظامِ معیشت ۷۹
☆ سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت ۸۸

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جدید اسلامی ریاست کے اجزائے ترکیبی

جدید اسلامی ریاست کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے نمایاں خدوخال کون کون سے ہیں' اس بارے میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بارہا اپنے خیالات کا اظہار فرما چکے ہیں' تحریری صورت میں بھی اور تقریری شکل میں بھی۔ لیکن ۷ نومبر کے ''نوائے وقت'' کے ادارتی کالم میں اداریہ نگار نے پاکستان کے قیام ہی کو اسلامی ریاست کی تشکیل کے مترادف قرار دیتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب سے براہ راست یہ سوال کیا کہ اگر ان کے نزدیک پاکستان ابھی تک ''اسلامی ریاست'' نہیں بن سکا تو آخر اسلامی ریاست سے ان کی مراد کیا ہے! جدید اسلامی ریاست کی جو تعبیر نوائے وقت جیسے مؤقر روزنامے کے اداریہ نگار نے کی ہے اور نفاذِ اسلام کا جو مفہوم معین کیا ہے وہ باعث حیرت ہی نہیں باعث افسوس بھی ہے...... قارئین کی دلچسپی کے لئے اس اداریئے کا متعلقہ حصہ اور اس کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب کا وضاحتی مضمون جس کے ذریعے جدید اسلامی ریاست کے خدوخال اور اس کے اجزائے ترکیبی زیادہ نکھر کر سامنے آتے ہیں' دونوں پیش خدمت ہیں۔ (ادارہ)

روزنامہ ''نوائے وقت'' کا ۷ نومبر ۱۹۹۳ء کا اداریہ

تنظیم اسلامی کے امیر اور داعیٔ تحریک خلافت ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطبۂ جمعہ کے دوران اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ بلاشبہ مسلم لیگ ایک قومی جماعت تھی اور اس کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس کی جدوجہد سے پاکستان بنا' لیکن یہ ملک ابھی تک اسلامی ریاست نہیں بن سکا' اس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس کے لوگ پہلے خود اپنی زندگیوں پر اسلام نافذ کریں اور پھر ملک میں اسلام کا نفاذ کریں۔ ڈاکٹر اسرار احمد سے بھی قوم یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ آخر اسلامی ریاست سے ان کی مراد کیا ہے اور اس وقت پچاس سے زائد آزاد مسلم ممالک میں سے کونسا ملک ایسا ہے جسے ڈاکٹر صاحب اسلامی ریاست کا ماڈل قرار دے سکتے ہیں۔ شکر کی بات یہ

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ اعتراف کر لیا کہ مسلم لیگ نے ایک قومی جماعت کے طور پر تحریک پاکستان کو منطقی کامیابی سے ہمکنار کیا اور اپنے وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت وجود میں آ گئی' لیکن ڈاکٹر صاحب ملک میں اسلام کے نفاذ کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں جس کے ارکان پہلے اپنی زندگیوں پر اسلام نافذ کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر وضاحت کر دیتے کہ آیا اس طرح کی جماعت سے ان کی مراد سابقہ جماعت اسلامی نہیں جس کے پلیٹ فارم سے خود انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کی تعریف و توصیف کے باوجود ڈاکٹر اسرار احمد کے لئے اس جماعت کو اسلامی کہنا مشکل ہو رہا ہے اور اس کا وہی مخصوص پس منظر ہے جس کی وجہ سے جماعت اسلامی کی پوری قیادت اور برصغیر کی دیگر مذہبی شخصیات از قسم مولانا آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مسلم لیگ اور قائداعظم کی مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی یہاں تک اصلاح کر لی ہے کہ وہ مولانا مدنیؒ اور مولانا آزادؒ کے ایک مخصوص رنگ کی وجہ سے ان کے مداح رہے ہیں جبکہ انہوں نے ان صاحبان کی متحدہ قومیت کی کانگریسی سوچ سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی نئی نسل کے سامنے مولانا آزاد اور مولانا مدنی کا وہی ایک روپ ہے جو ان کی کانگریس کی غلامی اور کانگریسی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ نئی نسل مولانا آزاد کو کانگریس کے صدر اور بھارتی حکومت کے ایک وزیر اور منتری کی حیثیت سے پہچانتی ہے اور مولانا مدنی نے جس طرح قومیت کے مسئلے پر حضرت علامہ اقبالؒ سے ''متھا'' لگایا اور جس طرح حضرت علامہ کو یہاں تک کہنا پڑا کہ ''از دیو بند حسین احمد' ایں چہ بوالعجبیست!''۔ مولانا مدنی انڈین نیشنلزم کے پرچارک تھے جبکہ حضرت علامہ کا فرمانا تھا کہ ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ''۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ حضرت علامہ اور قائداعظم کا نظریۂ قومیت علمائے دین کی ایسی برانڈ کے مقابلے میں درست ثابت ہوا اور پاکستان کا معرض وجود میں آنا ہی ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے مترادف ہے۔ یہاں ہم سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست کیسے کہہ دیا تو اس کا سادا اور عام فہم جواب یہ ہے کہ جب پاکستان بنا اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر مسلمان ممالک نے انگریز' فرانسیسی اور ولندیزی استعمار سے آزادی حاصل کی تو اس وقت تک دور حاضر کے تقاضے ہی بدل چکے تھے۔ مسلمان ممالک گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی سے غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس دوران میں ہماری سوچ جمود کا شکار رہی جبکہ اس عرصے میں دنیا میں تغیرات پیدا ہو چکے تھے۔ آج نصف صدی بعد آزاد مسلمان

© rasailojaraid.com

ممالک کی تعداد بھی نصف صد سے تجاوز کر چکی ہے لیکن آج کی دنیا نئے انقلابات سے دوچار ہے اور دورِ حاضر کے علوم وفنون اور تہذیب نے ایسا کمال حاصل کرلیا ہے کہ مسلمان ممالک کے لئے اس سے دوری بدقسمتی اور پسماندگی میں اضافہ ہی کرسکتی ہے اور کررہی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' مسلمانوں کا ذہن بالکل واضح ہے اور عبادات اور اعتقادات سے روگردانی کو کوئی بھی جائز تصور نہیں کرتا لیکن دورِ حاضر سے ہم آہنگی بھی لابدی تصور کی جاتی ہے۔

اگر جماعت اسلامی کی دنیاوی حالت پر نظر ڈالی جائے تو پچھلے چار پانچ عشروں میں ایک انقلاب آچکا ہے' آج جماعت کا ایئر کنڈیشنڈ ہیڈ کوارٹر جدید فن تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کے ہیڈ کوارٹر میں کس شے کی کمی ہے' اس کے بعد آخر اسلام کے نفاذ میں کہاں کمی دکھائی دیتی ہے۔ رہا موجودہ طرزِ سیاست تو ہر مذہبی جماعت اور ان کے رہنمایانِ کرام سیاسی عمل کی بدعت میں شریک ہیں' صدارت سے لے کر سینٹ' قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی تک کے انتخابات میں حصہ بھی لیتے ہیں۔

یہ صورت حال اجماع اُمت پر دلالت کرتی ہے کہ موجودہ انتخابی عمل میں حصہ لینا کوئی غیر اسلامی یا قبیح فعل نہیں رہا۔ انتخابات کے ذریعے اسلامی ریاست کے عوام کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے ایک سیاسی مشینری تشکیل دیتے ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی کی پابند ہے۔ یہی ایک ماڈرن اسلامی' جمہوری' فلاحی' پارلیمانی ریاست کی تعریف ہوسکتی ہے اور اگر ڈاکٹر اسرار احمد یا قبلہ جنرل حمید گل کے ذہن میں اسلامی ریاست کا کوئی دوسرا تصور ہو یا انڈونیشیا' ملائشیا سے لے کر عرب امارات' سعودی عرب' مصر' شام' یمن' اردن' مراکش' تیونس' ترکی' لیبیا' نائیجریا تک کسی بھی ملک کو اسلامی ریاست کا ماڈل سمجھتے ہوں تو وہ اس کی نشاندہی فرمادیں تاکہ قوم کے ذہن سے کنفیوژن دور ہوسکے۔

مدیر نوائے وقت کی ادارتی تحریر کے جواب میں اصل موضوع یعنی جدید اسلامی ریاست کے دستوری خاکے سے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل تین تمہیدی باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

پہلی یہ کہ اگر بقول ان کے ''پاکستان کا وجود میں آجانا ہی ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے مترادف ہے'' تو پاکستان سے کہیں زیادہ بھاری مسلم اکثریت والے بیسیوں ملک جو اس سے قبل دنیا کے نقشے پر موجود تھے کس بنا پر ''اسلامی ریاست'' کی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تعریف سے خارج کیے جا سکتے ہیں؟ اور اگر آج جو نصف صد سے بھی زائد مسلمان ملک دنیا میں موجود ہیں، جن میں سے تیرہ کے نام تو خود انہوں نے بھی گنوا دیئے ہیں، سب کے سب اسلامی ریاست قرار پا سکتے ہیں تو کیا اس کا منطقی نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ ؏ ''شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا!'' کے مطابق تسلیم کر لیا جائے کہ اسلامی ریاست کسی حقیقتِ واقعی کا نام ہے ہی نہیں!...... گویا ؏ '' کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!''......اور ؏ ''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!''۔

دوسری بات یہ کہ آج مسلمان تعداد میں سوا ارب سے زائد ہونے کے باوجود عالمی سطح پر ذلت اور مسکنت سے دوچار، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار اس بنا پر ہیں کہ پوری دنیا میں ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جسے اسلامی ریاست، معاشرت اور معیشت کا ''ماڈل'' قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ ہم بحیثیتِ مجموعی اور بحیثیت امت مسلمہ اپنے فرضِ منصبی سے کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں، اور اپنے عمل کے ذریعے ؏ ''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!'' پر عمل پیرا ہونے اور اس طرح ''شہادت علی الناس'' کا فریضہ ادا کرنے کی بجائے ''کتمانِ حق'' یعنی حق کو چھپا لینے کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور

''خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!''

کے مصداق مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا کوئی علاج اس کے سوا موجود نہیں کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں یعنی کم از کم کسی ایک ملک میں اسلامی ریاست کا صحیح ''ماڈل'' پیش کر دیا جائے۔ تاکہ نوعِ انسانی دینِ حق کی برکتوں کا مشاہدہ چشمِ سر سے کر سکے اور اس طرح اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اتمامِ حجت ہو جائے۔

تیسری بات یہ کہ فی الواقع اس مقصدِ عظیم کی خاطر پاکستان قائم ہوا ہے اور ان شاء اللہ العزیز ایک صحیح اسلامی ریاست کا ''ماڈل'' بننے کی سعادت اسی سرزمین کو حاصل ہو گی۔ چنانچہ مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی اور گزشتہ چار سو سال کی تاریخ

© rasailojaraid.co

سے قطع نظر' یہی بات جو مصور و مفکر پاکستان علامہ اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں ارشاد فرمائی تھی ...... یعنی:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام تقدیر الٰہی ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات کے چہرۂ روشن پر جو پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اصل اسلام کی ایک جھلک نوعِ انسانی کو دکھا سکیں!''

اور یہی بات بانی و معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی فرمائی تھی کہ:

''ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں!''

یہ دوسری بات ہے کہ چونکہ اُس وقت کے حالات میں حصولِ پاکستان کے لئے تحریک لامحالہ ''قومی'' بنیادوں پر ہی چلائی جا سکتی تھی لہٰذا ہر وہ شخص شریک اور شامل کر لیا گیا جو مسلمانوں کا سا نام رکھتا ہو' خواہ اس کا عمل اور کردار کیسا ہی ہو' لہٰذا قیامِ پاکستان کے بعد خود قائداعظم کو کہنا پڑا کہ میری جیب میں سوائے کھوٹے سکوں کے اور کچھ نہیں ہے! ...... الغرض قیامِ پاکستان کو اگرچہ یقیناً اسلامیانِ ہند کی بہت بڑی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے فضل و کرم کے مظہر ہونے کی حیثیت حاصل ہے' تاہم یہ ہمارے سفر کی صرف پہلی منزل ہے۔ اور ع ''وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے!'' کے مصداق سفر کا اصل اور زیادہ کٹھن مرحلہ ابھی سر کرنا ہے۔ اور اس کے لئے اگرچہ اصل ضرورت تو ایک ایسی جماعت کی ہے جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو اولاً خود اپنی ذات اور دائرۂ اختیار میں اسلام کو بالفعل نافذ کریں اور پھر نظامِ باطل کو بدلنے کے لئے نہ صرف یہ کہ تن من دھن وقف کر دیں' بلکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک مضبوط اور منظم جماعت کی صورت اختیار کر کے بالفعل ''حزب اللہ'' بن جائیں' تاہم اس کی پہلی اور کم از کم' اور قطعاً ناگزیر اور لازمی و لابدی شرط یہ ہے کہ اس حقیقت کو سمجھ اور مان لیا جائے کہ ع ''ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!'' کے مصداق موجودہ جملہ مسلمان ممالک اور ایک ''حقیقی اسلامی ریاست'' میں زمین اور آسمان کا فرق ہے!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ ''جدید اسلامی ریاست'' کے عنوان سے از خود ظاہر ہے کہ ہماری مطلوب و مقصود اور زیر بحث و نظر ریاست میں دو اوصاف لازماً ہونے چاہئیں، یعنی ایک اسلام اور دوسرے جدیدیت! تو جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ہر شخص خواہ وہ خود بالفعل اسلام پر عمل پیرا ہو یا نہ ہو، جانتا ہے کہ اسلام نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بے چون و چرا فرمانبرداری اور بلا استثناء اطاعت کا! لہٰذا اس کے بارے میں کسی مزید بحث و گفتگو اور قیل و قال کی ضرورت نہیں ہے!

البتہ ''جدیدیت'' سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے کون سے اجزاء ہمارے لئے قابل قبول ہیں اور کون سے نہیں؟ اس معاملے کی اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور بحث و تمحیص ضروری ہے۔ اس لئے کہ اصل ''کنفیوژن'' اسی معاملے میں پایا جاتا ہے۔ اور اگرچہ علامہ اقبال نے اصولی اعتبار سے تو بالکل بجا طور پر فرمایا ہے کہ ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید!

تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ اصول صد فی صد یا تو صرف فرد اور اس کی نفسیات پر منطبق ہوتا ہے یا عمرانیات و اجتماعیاتِ انسانی کی صرف اوّلین اور اہم ترین منزل یعنی نظامِ معاشرت اور عائلی قوانین پر، جنہیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''تدبیرِ منزل'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں صرف اصول و مقاصد ہی نہیں تفصیلی قوانین بھی پورے شرح و بسط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے ابدی و سرمدی کلام میں بیان فرما دیئے، جن کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ ششم میں بجا طور پر فرمایا ہے کہ مغرب سے مرعوب جدید ذہن ان کے ظاہری خد و خال میں الجھ کر رہ گیا ہے اور ان کی تہہ میں کارفرما حکمتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ــــــ بہرحال اس کے بالکل برعکس معاملہ ہے سیاست و ریاست کا، کہ ان کے ضمن میں کتاب و سنت میں صرف اصولی ہدایات پر اکتفا کی گئی ــــــ اور کوئی تفصیلی خاکہ یا ڈھانچہ نہیں دیا گیا۔ اس لئے کہ اس میدان میں نوعِ انسانی کے عمرانی ارتقاء کا سفر ابھی جاری تھا۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے وقت ہی نہیں،

© rasailojaraid.co

اس کے ایک ہزار سال بعد تک بھی ذہنِ انسانی پر یہ حقیقت منکشف نہیں ہوسکی کہ ''ریاست'' اور ''حکومت'' دو جدا چیزیں ہیں۔ اور حکومت کی حیثیت ریاست کے صرف انتظامی ادارے کی ہے اور شہریوں کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے نہ کہ حکومت سے! اور حکومت کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا تو شہریوں کا بنیادی حق ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما' اگرچہ صرف حکومت کی اصلاح (یا تبدیلی) کے لئے اٹھے تھے لیکن ''حکومتِ وقت'' کے لئے انہیں ''باغی'' قرار دینا آسان ہوگیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ اسلامی ریاست کے خلاف علم بلند نہیں کیا تھا!

الغرض سیاست اور ریاست کے میدان میں دو حقائق کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ایک یہ کہ اس معاملے میں ہمیں کتاب وسنت سے صرف اصول لینے ہوں گے اور ان کے ساتھ عمرانی ارتقاء کے ثمرات میں سے جو کتاب وسنت کے منافی نہ ہوں انہیں لازماً شامل کرنا پڑے گا ـــــ اور دوسری' اور قدرے تلخ حقیقت یہ کہ اس عمرانی ارتقاء میں ہم مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے' یہ کُل کا کُل مغرب اور زیادہ معین طور پر یورپ میں ہوا ہے' تاہم یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ یہ نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے' اور جس طرح ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں مغرب کی دریافتوں اور ایجادوں سے بھرپور طور پر مستفید ہو رہے ہیں' اسی طرح ہمیں اس کی عمرانی ترقی اور اس میدان میں ان کی ''یافت'' کے بارے میں بھی زیادہ حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ یہ فرق بہرحال ملحوظ رہے گا کہ طبعی سائنس پر مبنی ٹیکنالوجی کُل کی کُل ''مباحات'' میں شامل ہے (صرف اس کا غلط استعمال معصیت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔) جبکہ عمرانی ارتقاء کے ثمرات کے ضمن میں ہمیں صحیح وغلط اور حلال وحرام کے مابین امتیاز بہرصورت کرنا ہوگا۔

(یہاں صرف برسبیلِ تذکرہ یہ اشارہ مناسب ہے کہ معاشیات اور اقتصادیات کا معاملہ ایک جانب معاشرت اور عائلی قوانین' اور دوسری جانب سیاست وریاست کے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بین بین واقع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ضمن میں قرآن حکیم نے جہاں اصول و مقاصد بھی واضح کر دیئے ہیں، وہاں بعض معین احکام بھی دے دیئے ہیں، اگرچہ اتنے تفصیلی نہیں جتنے معاشرت اور ''تدبیرِ منزل'' کے ضمن میں!)

اس تمہید کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ تصورِ ریاست و سیاست کے ضمن میں ''جدیدیت'' کن عناصر سے مرکب ہے۔ مختصر ترین اور سادہ ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو ع ''یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان'' کے مصداق ''جدیدیت'' بھی چار عناصر سے مرکب ہے، جن میں سے دو تو اسلام کی اساسی تعلیمات کے قطعاً منافی ہیں جن کا ترک واجب ہے، بقیہ دو میں سے بھی ایک وہ ہے جو تھا ہی اصلاً اسلام کی دین اور عطا، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں نے بہت جلد اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیا تھا۔ البتہ دوسری (اور کل تعداد کے اعتبار سے چوتھی) چیز وہ ہے جو کل کی کُل مغرب کی ''یافت'' ہے جسے ہمیں اس کے شکریئے کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے اور زیادہ گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو وہ ہے بھی خالص تکنیکی نوعیت کی شے!

چنانچہ وہ دو عناصر جو دورِ حاضر کی ریاست اور سیاست کی رگ و پے میں زہرِ ہلاہل کی طرح سرایت کئے ہوئے ہیں اور جن کی اسلام کے ساتھ نہ صرف یہ کہ کوئی مناسبت نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کی اساسی تعلیمات کی عین ''ضد'' اور کلی نفی کی حیثیت رکھتے ہیں، سیکولرزم اور نیشنلزم ہیں۔ اور ہم مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند پر علامہ اقبال کے فکر اور فلسفے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی فضل و کرم ہوا ہے، اس کے باعث ہم پر ان دونوں نظریات کا نوعِ انسانی کے حق میں زہرِ ہلاہل کی طرح مہلک اور اسلام کی اساسی تعلیمات کی عین ضد ہونا اتنا واضح اور مبرہن ہے کہ ان پر کسی گفتگو کی نہ صرف یہ کہ کوئی حاجت محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ قرطاس و قلم اور وقت و قوت کا خالص ضیاع نظر آتا ہے۔ تاہم صرف ضیافتِ طبع کے لئے سیکولرزم کی نفی کے لئے علامہ اقبال کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں جو اس ملحدانہ اور مشرکانہ تصور کے خلاف سیفِ قاطع کی حیثیت رکھتے ہیں...... یعنی۔

© rasailojaraid.co

© rasailojaraid.co

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ، ہوس کی وزیری!

اور ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

رہا نیشنلزم یعنی ''وطنی قومیت'' کا نظریہ تو اس پر تو ان کی مکمل نظم نہ صرف یہ کہ ''ضربِ حیدریؓ '' کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ ایک جانب غالب کے اس مصرعے کی مصداقِ کامل ہے کہ ع ''عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں!'' تو دوسری جانب غالب کے بارے میں حضرت علامہ کا یہ شعر یعنی ؎

''فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!''

کی مصداقِ اَتم ہے۔ مزید برآں حضرت علامہ کی یہ نظم اس اعتبار سے بھی ''جوامع الکلم'' کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں آغاز میں گفتگو خالص دینی اور اسلامی اعتبار سے ہوئی ہے۔ چنانچہ وطنی قومیت کے نظریئے کو عہدِ حاضر کے عظیم ترین ''شرک'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے زیر اثر وطن ایک ''معبود'' کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے' بقحوائے ؎

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اور اختتام پر گفتگو خالص انسانی سطح پر ہوئی ہے' یعنی ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

اور ؎

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اور آخری شعر میں ان دونوں کو جمع کر لیا گیا ہے...... یعنی۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے!

الغرض، ہمیں جدید تصورِ ریاست کے ان دو عناصر کو تو "جدید اسلامی ریاست" کے تصور سے لازماً اور قطعی طور پر خارج کرنا ہوگا ہی' ان کے منطقی لوازم اور متضمنات کی بھی کامل بیخ کنی کرنی ہوگی۔

جدید تصورِ ریاست کا وہ عنصر جو حدیثِ نبویؐ: "اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ" کے مطابق مؤمن کی گمشدہ متاع کی حیثیت رکھتا ہے اس کا "ری پبلکن" مزاج ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے ان دو اشعار میں بھی جو فصاحت و بلاغت کی انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہیں سب سے زیادہ اشارہ اسی حقیقت کی جانب کیا ہے کہ۔

© rasailojaraid.co

"ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ ست!"

(فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم!)

اور اپنے مشہور خطبات میں انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ:

"ری پبلکن طرزِ حکومت نہ صرف یہ کہ اسلام کی روح کے ساتھ کامل مطابقت رکھتا ہے بلکہ عالم اسلام میں جو نئے عوامل برسرکار ہو چکے ہیں ان کے پیشِ نظر ناگزیر بھی ہے"۔ (خطبۂ ششم)

اور اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت درکار ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام نہ ملوکیت اور شہنشاہیت پر مبنی تھا' نہ برہمیت اور پاپائیت پر۔ بلکہ الفاظ قرآنی "اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ" کے مطابق اس کے جملہ معاملات مسلمانوں کے باہمی مشورے سے طے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی ایسے ہندو مہاتما کو بھی ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار ہندوستان میں صوبائی وزارتیں قائم ہوئیں تو کانگرسی وزراء کے سامنے قابلِ تقلید

© rasailojaraid.co

مثالوں کی حیثیت سے صرف ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لیتے ہیں۔ اس لئے کہ قدیم ہند کی تاریخ میں بکرماجیت ہوں یا اشوک، اور چندر گپت ہوں یا کنشک، ان کی انفرادی سیرت و کردار سے قطع نظر، ان کا نظام بہرحال ملوکیت اور شہنشاہیت پر مبنی تھا! لہٰذا انہیں آج کے دور میں قابلِ تقلید مثالوں کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا! —— تاہم اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد عالمِ اسلام میں تو رفتہ رفتہ ملوکیت نے جڑیں پکڑ لیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں تو بقول جناب نعیم صدیقی ''پھر تخت بچھے، ایوان سجے'' والا معاملہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا، البتہ غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے حریتِ فکر اور علم و حکمت کے جو سوتے وسطی یورپ کے ممالک تک پہنچے، جن کے زیرِ اثر وہاں ایک جانب احیاء العلوم اور دوسری جانب اصلاحِ مذہب کی تحریکیں برپا ہوئیں ان ہی کے ایک منطقی نتیجے کے طور پر بالآخر انقلابِ فرانس کا ظہور ہوا اور دنیا میں دوبارہ ری پبلکن طرزِ حکومت کا آغاز ہوا۔ بہرحال جدید تصورِ ریاست کا یہ عنصر ہم مسلمانوں کے لئے اپنی ''گمشدہ متاع'' کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا حدیثِ نبویؐ کے الفاظ کے مطابق اس پر تو ہمارا ''حق'' دوسروں سے فائق ہے۔

البتہ آخری چیز جو کُل کی کُل مغرب کی ''یافت'' کی حیثیت رکھتی ہے اور جس پر ہمیں انگریزی زبان کی ضرب المثل ''شیطان کو بھی اس کا جائز حق ضرور دیا جانا چاہئے!'' کے مطابق مغرب کا ممنون ہونا چاہئے، اور جسے ان کے شکریئے کے ساتھ قبول کر لینا ہمارے اپنے حق میں مفید اور خواہ مخواہ رد کر دینا ہمارے اپنے لئے ہی مضر ہے، وہ ہے ایک جمہوری ریاست اور ری پبلکن طرزِ حکومت کے تین اعضائے رئیسہ یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کی تعیین، پھر ان کے جداگانہ وظائف و فرائض کا تعین، اور سب سے بڑھ کر ان کے مابین اختیارات کے ضمن میں تحدیدات اور توازن کا نظام۔ اور ''آخری لیکن کمترین نہیں'' کے مصداق اس مخصوص نظامِ ریاست و حکومت کے لئے اساسی اداروں کی تشکیل، جیسے سیاسی جماعتوں اور انتخابات کا نظام، اور پریس اور اس کا مناسب اخلاقی حدود کے اندر تنقید کا حق وغیرہ!...... یہ تمام چیزیں، جیسے کہ پہلے عرض کیا

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جا چکا ہے‘ درحقیقت ایک نوع کی ’’ٹیکنالوجی‘‘ ہی ہے۔ اسی لئے انہیں مجموعی طور پر ’’سٹیٹ کرافٹ‘‘ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ضمن میں وہی اصول درست ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے‘ یعنی یہ کہ جو چیز کتاب و سنت کے بالکل منافی ہو ردّ کر دی جائے‘ باقی کو اسلام کے اصولوں کے ساتھ شامل کر کے ’’جدید اسلامی ریاست‘‘ کا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔

اس سلسلے میں جو کچھ اب تک بیان ہو چکا اس کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ —

چونکہ:

۱) اسلام نے ریاست کے ضمن میں صرف اصول دیئے ہیں‘ تفصیلی خاکہ یا ڈھانچہ کوئی نہیں دیا۔

© rasailojaraid.co

۲) ری پبلکن طرزِ حکومت نہ صرف اسلام کی روح کے عین مطابق ہے‘ بلکہ اصلاً اسی کا عطا کردہ ہے۔

۳) جدید ریاست کے اعضاءِ رئیسہ (مقننہ‘ انتظامیہ اور عدلیہ) کے وظائف و فرائض‘ ان کے مابین حقوق و اختیارات کی تقسیم اور توازن کا نظام اور مختلف جمہوری اداروں کی تشکیل‘ یعنی فی الجملہ ’’سٹیٹ کرافٹ‘‘ ایک نوع کی ٹیکنالوجی ہے جو اکثر و بیشتر ’’مباح کے درجہ میں ہے ——

لہٰذا اگر عہد حاضر کی جمہوری ریاست کے تصورات میں صرف دو تبدیلیاں کر دی جائیں تو وہ ’’جدید اسلامی ریاست‘‘ کی صورت اختیار کر لے گی۔ پہلی تبدیلی یہ کہ سیکولرزم کے تصور کو نکال دیا جائے اور اسلام کو صرف ’’سرکاری مذہب‘‘ کے طور پر نہیں بلکہ دین اور دنیا اور مذہب و ریاست کی جامع حقیقت کی حیثیت سے پورے نظامِ زندگی پر غالب و نافذ قرار دیا جائے اور دوسری تبدیلی یہ کہ ’’وطنی قومیت‘‘ کی بجائے ’’مسلم قومیت‘‘ کو بطورِ اساس قبول کیا جائے۔

اس کے عملی نتیجے کو سادہ ترین الفاظ میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ —— عہد حاضر کے کسی بھی جمہوری نظامِ حکومت میں‘ خواہ وہ پارلیمانی ہو‘ خواہ صدارتی‘ اور خواہ

© rasailojaraid.co

وحدانی ہو خواہ وفاقی، اگر تین چیزیں شامل کر لی جائیں، جو باہم لازم وملزوم اور ایک دوسرے کے منطقی نتیجے کی حیثیت رکھتی ہیں تو وہ اسلامی ریاست بن جائے گی۔ یعنی:

۱) اولاً یہ تسلیم کیا جائے کہ یہاں حاکمیت اصلاً اللہ کی ہے اور انسان کے پاس صرف ''خلافت'' ہے۔

۲) دوسرے یہ کہ یہاں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو ہر چیز پر بالاتری اور بالادستی حاصل ہوگی اور کوئی قانون کتاب وسنت کے منافی نہیں بنایا جا سکے گا ___ اور

۳) تیسرے یہ کہ اگرچہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور عقیدے، عبادات اور پرسنل لاء کی آزادی کی ضمانت کے حق میں بلالحاظِ رنگ ونسل اور بلا امتیاز عقیدہ و مسلک تمام شہری برابر کے شریک ہوں گے، لیکن قانون سازی کے عمل اور ریاست کی بلند ترین پالیسی کی تعیین وتشکیل میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکیں گے جو اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔

اب اگر ان تینوں اعتبارات سے وطنِ عزیز پاکستان کے معروضی حالات کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل صورت سامنے آتی ہے:

۱) چونکہ پاکستان ایک ایسی زبردست عوامی تحریک کے نتیجے میں قائم ہوا تھا جس کی بنیاد ''مسلم قومیت'' کے اصول اور نظریئے پر تھی، لہٰذا جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تو یہاں بہت جلد اور بہت آسانی سے طے ہو گئی تھی۔ چنانچہ ''قراردادِ مقاصد'' کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے اقرار کے ساتھ ساتھ وضاحت کر دی گئی تھی کہ اہالیانِ پاکستان کے پاس جو بھی اختیار واقتدار ہے وہ حاکمِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ''مقدس امانت'' کی حیثیت رکھتا ہے اور صرف ان حدود کے اندر اندر استعمال ہو گا جو اس اصل حاکم نے معین کر دی ہیں۔ مزید برآں یہاں جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور سماجی عدل کے وہ تصورات اور معیارات نافذ کیے جائیں گے جو اسلام نے معین کیے ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس اعتراف اور اعلان نے ریاستِ پاکستان کی اساسی نوعیت اور آئندہ بننے والے مفصل دستور کے خدوخال کو واضح طور پر

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

متعین کر دیا تھا۔ اور بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ پورے عالمِ انسانی پر مادیت، الحاد اور سیکولرزم کا فیصلہ کن غلبہ تھا دس کروڑ سے زائد انسانوں کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی کی جانب سے یہ اعلان اور اظہار ــــــ ع ''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!'' کے مصداق ہر گز کسی ''معجزے'' سے کم نہیں تھا۔

لیکن چونکہ اس قرارداد کی حیثیت صرف ''مقدمۂ دستور'' کی رہی، جس کی بنیاد پر کسی عدالت میں کوئی مرافعہ دائر نہیں کیا جا سکتا تھا، لہٰذا یہ عملی طور پر بالکل غیر مؤثر رہی اور مرحوم صدر ضیاء الحق نے ۱۹۸۵ء میں اسے دفعہ ۲۔ الف کے طور پر ''جزوِ دستور'' بنایا بھی تو ایسے نیم دلانہ اور سطحی انداز میں کہ دستور کی دیگر مختلف دفعات میں جو چیزیں کسی اعتبار سے اس سے مختلف یا متصادم موجود تھیں انہیں بھی برقرار رکھا اور خارج یا ساقط نہیں کیا۔ لہٰذا اس سے اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں میں شدید ابہام بلکہ تصادم پیدا ہوا کہ کسی صوبائی عدالتِ عالیہ نے اس دفعہ ۲۔ الف کو دوسری دفعات کی ''ناسخ'' مان کر اس کے مطابق کوئی فیصلہ صادر کر دیا تو سپریم کورٹ نے دستور پاکستان ہی کی کسی دوسری دفعہ کے حوالے سے اسے کالعدم قرار دے دیا۔

بہرحال اب اگر ہمیں فی الواقع خلوصِ قلب اور عزمِ مصمم کے ساتھ پاکستان کو حقیقی اسلامی ریاست بنانا ہے تو لازم ہے کہ اس قرارداد کو دستور کی دفعہ ۲۔ الف نہیں بلکہ اصل دفعہ ۲ قرار دیا جائے، اور اصل دفعہ کے موجود الفاظ یعنی ''پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا'' کو یا تو سرے سے حذف کر دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ سیکولرزم کے نظریۂ ریاست کے تحت مذہب کے محدود تصور کی غمازی کرتے ہیں یا انہیں قراردادِ مقاصد کی توضیح مزید کے طور پر مزید ذیلی دفعہ ۲۔ الف کی حیثیت دی جائے۔

۲) بالکل یہی معاملہ قرآن و سنت کی کامل بالادستی کے ضمن میں ہوا۔ یعنی یہ کہ اگرچہ یہ دفعہ پاکستان کے ہر دستوری مسودے میں شامل رہی کہ: ''یہاں کوئی قانون سازی کتاب و سنت کے منافی نہیں کی جا سکتی'' لیکن یہ بھی ایک طویل عرصے تک تو صرف ''رہنما اصولوں'' کے زمرے میں شامل اور اس لئے عملاً غیر مؤثر رہی۔ اور

© rasailojaraid.com

جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں اس پر کسی قدر عملی پیش رفت کا آغاز ہوا بھی تو ایسے نیم دلانہ سے بھی کم تر انداز میں اور اتنی اگر مگر کے ساتھ کہ پورا معاملہ ایک لاحاصل مشق (Exercise in futility) ہی نہیں باقاعدہ کھیل تماشے کی صورت اختیار کر گیا۔ تاہم چونکہ یہ معاملہ ''اللہ کی تشریعی حاکمیت'' کے بالفعل نفاذ کی واحد عملی صورت کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کے گہرے تجزیئے اور اس کے صحیح اور غلط اجزاء کی واضح نشان دہی کی شدید ضرورت ہے۔

اس سلسلے کی پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس کا جو عملی راستہ اختیار کیا گیا وہ اصولی طور پر بالکل درست تھا۔ یعنی یہ کہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی رائج الوقت قاعدہ اور قانون یا زیرِ تجویز مسودۂ قانون، کلی یا جزوی طور پر کتاب وسنت سے متصادم یا ان کی حدود سے متجاوز ہے یا نہیں اعلیٰ عدالتوں ہی کو کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ جدید تصورِ ریاست کے مطابق دستورِ مملکت کی پاسداری اور اس کے مطابق انتظامیہ اور مقننہ کی نگرانی اعلیٰ عدالتوں ہی کا فریضہ اور وظیفہ ہے۔ یعنی جس طرح دستور میں طے شدہ بنیادی حقوقِ شہریت پر انتظامیہ یا مقننہ کی دست درازی پر ہر شہری کو حق حاصل ہوتا ہے کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے پر دستک دے، اسی طرح اگر کسی ریاست کے دستور میں یہ طے کر دیا گیا ہو کہ یہاں قرآن اور سنتِ رسول ﷺ کو مطلق بالادستی حاصل رہے گی اور کوئی قاعدہ یا قانون کتاب وسنت کے منافی نہیں بنایا جا سکے گا تو اگر کسی شہری کا یہ خیال ہو کہ کسی معاملے میں اس اصول کی خلاف ورزی ہو رہی ہے تو اسے حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اعلیٰ عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکے۔ اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اس کے ضمن میں نفیاً یا اثباتاً فیصلہ صادر کر سکے، اور اگر اس کی رائے میں کوئی قانون جزوی یا کلی طور پر اس دفعہ کی زد میں آتا ہو تو اسے کالعدم قرار دے سکے۔ اگرچہ اس طرح جو خلا پیدا ہو گا اسے پُر کرنے اور کالعدم قرار پانے والے قانون کی جگہ متبادل قانون سازی کا اختیار بہرصورت مقننہ ہی کو حاصل رہے گا جس کے لئے اسے معین مہلت دی جا سکتی ہے، بلکہ دی جانی چاہیئے۔

© rasailojaraid.com

اس مشکل مرحلے کے اس واحد ممکن العمل حل کے علاوہ جتنی دوسری صورتیں آج تک تجویز کی گئی ہیں وہ یا روحِ دین سے متصادم ہیں، یا روحِ عصر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً سب سے پہلی تجویز جو خود بخود ذہن میں آتی ہے مقنّنہ کے ساتھ ایک ''علماء بورڈ'' کی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ کے دوران بھی سب سے پہلے اسی تجویز کو اختیار کیا گیا تھا، جس نے بعد میں ذرا سے فرق کے ساتھ ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کی صورت اختیار کی۔ لیکن اس کے ضمن میں فوری طور پر جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس بورڈ یا کونسل کا فیصلہ آخری اور حتمی ہو گا یا اس کی حیثیت محض ''سفارش'' کی ہو گی۔ پہلی صورت اختیار کی جائے تو یہ ''تھیا کریسی'' بن جاتی ہے، جو روحِ عصر سے بھی براہِ راست متصادم ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں بھی اُس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور دوسری صورت میں اگر آخری فیصلہ کا دارومدار منتخب نمائندوں کی عددی اکثریت ہی پر رہتا ہے تو یہ نہ صرف یہ کہ ''حاکمیتِ عوام'' کا وہ سیکولر تصور ہے جو اللہ کی حاکمیت سے متصادم ہے بلکہ اس صورت میں بورڈ یا کونسل کی حیثیت عضوِ معطل کی سی ہو جاتی ہے۔ (جیسا کہ فی الواقع ہوا بھی۔ چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے انبار وزارتِ قانون کی الماریوں میں دفن ہوتے چلے گئے اور قوم کا وہ پیسہ جو اس پر خرچ ہوا مسلسل ضائع ہوتا رہا)۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبۂ ششم میں اگرچہ علماء بورڈ کی تجویز کو عارضی طور پر اختیار کرنے کی اجازت دی تھی، تاہم اسے ''خطرناک'' بھی قرار دیا تھا اور مستقل نظام کے اعتبار سے اسے بالکل مسترد کر دیا تھا۔

اس کے برعکس اگر کتاب وسنت کی بالادستی کو اصولاً تسلیم کر کے اس کے عملی نفاذ کے معاملے کو کلیتاً پارلیمنٹ یا مقنّنہ ہی کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو منطقی طور پر لازم ہو گا کہ پارلیمنٹ کے لئے انتخابات میں حصّہ لینے کی اہلیت کے ضمن میں سیرت وکردار کی درستی اور اس معاملے میں کم از کم معیار کے لزوم کے ساتھ ساتھ دین وشریعت کے بنیادی علم وفہم کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے، اور ایک طویل المیعاد منصوبے کے اعتبار

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

سے یہ نا قابلِ عمل بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ نے بھی اپنے مذکورہ بالا خطبے میں علماء بورڈ کے متبادل کے طور پر یہی تجویز فرمایا ہے کہ ایک جانب علماءِ دین اور ماہرینِ شریعت خود مقننہ میں مؤثر حیثیت سے شریک ہوں اور دوسری جانب ملک کے نظامِ تعلیم میں دین و شریعت کے علم و فہم کو جزو لاینفک کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ تاہم ایک تو فی الوقت کم از کم قابلِ دید مستقبل کی حد تک یہ دونوں باتیں حاصل اور دستیاب نہیں ہیں۔ دوسرے ہر معاملے میں آخری فیصلہ کا دار و مدار بالعموم نہایت باریک اور پیچیدہ قانونی اور علمی نکات پر ہوتا ہے جن پر بحث و تمحیص کی مناسب جگہ جس طرح ''جلسۂ عام'' اور ''ہجومِ مؤمناں'' نہیں ہوتا اسی طرح پارلیمنٹ کا فلور بھی نہیں ہوتا جہاں ساری بحث اور کُل جنگ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے مابین سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے مناسب جگہ عدالت ہی ہوتی ہے جہاں ماہرینِ قانون و دستور کو بھی بحث و تمحیص کا پورا حق اور موقع حاصل ہوتا ہے اور علماءِ دین اور ماہرینِ شریعت کو بھی اپنے دلائل پیش کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جانبین کی طرف سے مسئلے کی پوری چھان پھٹک' اور جملہ مخالف و موافق دلائل کے سامنے آنے کے بعد عدالت کے لئے صحیح فیصلے تک پہنچنا قطعاً مشکل نہیں رہتا۔

الغرض' ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں قرآن و سنت کی بالادستی کی عملی تنفیذ کے ضمن میں پیش رفت کے لئے جو راستہ اختیار کیا گیا وہ اصولاً تو درست تھا لیکن ع ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے۔ ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے!'' کے مصداق چونکہ وہ اس معاملے میں بالفعل ''دیوانگی'' کی بجائے زمانہ سازی والی ''فرزانگی'' پر عمل پیرا تھے' لہٰذا انہوں نے درست سمت میں اقدام کے ساتھ تین کام ایسے بھی کئے جنہوں نے اس پورے معاملے کو فی الواقع ''تماشا'' بنا کر رکھ دیا۔ یعنی:

۱) اولاً شرعی عدالتوں یا عدالت کا جداگانہ نظام' جس سے دین و دنیا اور مذہب و ریاست کی ''دوئی'' اور علیحدگی کے سیکولر تصور کو تقویت حاصل ہوئی۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

۲) شرائطِ ملازمت اور حقوق و مراعات کے باب میں شرعی عدالت کے جج صاحبان کا معیار موجودہ دنیا کے مروّجہ اور مسلّمہ معیارات (جو خود ہمارے ملک میں بھی دوسری عدالتوں کے ضمن میں رائج ہیں) سے کم تر رکھا' جس سے ان شبہات کو تقویت حاصل ہوئی کہ درحقیقت یہ سارا کھیل اپنی سیاسی مصلحتوں اور مقاصد کے تحت کھیلا جا رہا ہے۔ اور

۳) سب سے بڑھ کر یہ کہ ''وفاقی شرعی عدالت'' کے دونوں ہاتھوں میں دو ہتھکڑیاں بھی پہنا دیں' اور دونوں ٹانگوں میں دو بیڑیاں بھی ڈال دیں —— یعنی ایک جانب دستورِ پاکستان اور عدالتی قوانین کو اس کے دائرہ کار سے باہر قرار دے دیا تو دوسری جانب مالی معاملات' اور حد یہ ہے کہ عائلی قوانین تک کو اس کی ''دستبرد'' سے محفوظ کر دیا اور اس طرح گویا پورے ملک اور پوری قوم کو اس پوزیشن میں کھڑا کر دیا جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ﴾

''تو کیا تم (ہماری) کتاب کے کچھ حصّے کو مانتے ہو اور کچھ حصے کو نہیں مانتے؟ تو جان لو جو لوگ یہ روش اختیار کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ذلت اور رسوائی میں مبتلا کئے جائیں' اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں!'' (اعاذنا اللہ من ذلک)

قصہ مختصر' اگر ہماری نیت اور ارادہ پاکستان میں فی الواقع ایک حقیقی اسلامی ریاست قائم کرنے کا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ ملک کے دستورِ اساسی کی نافذ العمل اور واجب العمل دفعات میں قراردادِ مقاصد کو دفعہ ۲ کی حیثیت دینے کے فوراً بعد اس دفعہ کو شامل کیا جائے کہ ''یہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کو ہر معاملے میں مطلق بالادستی حاصل ہو گی اور کسی بھی سطح پر کوئی قاعدہ یا قانون ایسا نہیں بنایا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے منافی ہو!'' اور اس کی عملی تنفیذ کا یہی راستہ اختیار کیا

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c